Al-Hikmat

Volume 30 (2010) p.p.15-43

سرسید، اکبرالہ آبادی اور علامہ اقبال

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا
پرنسپل ریٹائرڈ اورینٹل کالج، جامعہ پنجاب، لاہور، پاکستان

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جب انگریز دوبارہ ملک پر قابض ہو گئے تو ہندوستان کے لوگوں خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا اس کے تصور ہی سے لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

اگرچہ اس شورش دار و گیر میں بہت سے ہندوؤں نے بھی حصہ لیا تھا بلکہ بعض مورخین کے بقول یہ انھی کی شروع کی ہوئی شورش تھی لیکن مسلمانوں نے عملاً اس میں زیادہ حصہ لیا جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے سات آٹھ سو سالہ اقتدار کا خاتمہ ہونے پر انگریز حکمران بن گئے تھے۔ ہندوؤں کے لیے یہ محض حاکموں کی تبدیلی کا مسئلہ تھا اس لیے انھوں نے من حیث القوم انگریز سے تعاون کا سلسلہ نسبتاً خوش دلی سے شروع کر دیا تھا انگریزوں کے دوبارہ غلبے کے بعد مسلمانوں پر بہت ظلم و ستم روا رکھا گیا۔ ان کے بے شمار خاندان صفحۂ ہستی سے مٹ گئے اور کئی سال بعد تک انتہائی مفلسی اور کس مپرسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوئے۔ جاگیردار طبقے سے جاگیریں چھین کر نیلام کر دی گئیں، تجارت پہلے ہی ہندوؤں کے قبضے میں تھی۔ تھوڑے سے مسلمان تجار تھے وہ بھی میدان سے باہر ہوئے۔ قلعے سے تعلق رکھنے والے خود بھیک مانگنے پر مجبور تھے اس لیے مغلیہ سلطنت کے ملازمین کو کون پوچھتا؟

مسلم معاشرہ اٹھارویں صدی کے آغاز سے بُری طرح زوال کا شکار تھا۔ شرفاء کے بچے تعلیم سے بے بہرہ تھے، جاگیریں ہندو بنیے کے پاس رہن ہو چکی تھیں۔ کھیل تماشے، میلے ٹھیلے، شراب اور جُوا، رقص و موسیقی، عرس اور قوالیاں مشاعرے اور مجرے ان کی زندگیوں میں اس طرح شامل ہو چکے تھے کہ ان کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی محال تھا۔ احیائی تحریکیں ناکام ہو چکی تھیں یا ان کا دائرہ کار بہت محدود ہو چکا تھا۔ زمانہ بدل گیا تھا۔ یورپی اقوام سائنس اور ٹیکنالوجی میں روز افزوں ترقیوں کی بدولت بہت آگے نکل گئی تھیں اور ہندوستان ہی نہیں، تمام مسلم ممالک میں تعلیم قواعدِ زبان، تفسیر قرآن و تدریس حدیث، یونانی طب و نجوم تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

جب ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی رہی سہی قوتیں بھی منتشر ہو کر رہ گئیں اور پھر بھی یہ احساس پیدا نہ ہوا کہ حالات کی انقلابی تبدیلیوں کے ساتھ انھیں بھی تبدیل ہونے کی ضرورت ہے تو سرسید میدان میں آئے اور انھوں نے امراض کی درست تشخیص کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا علاج تجویز کیا اور درستیٔ حالات کے لیے ایک بڑی تحریک کا آغاز کیا۔

اس زمانے میں پہلی ضرورت یہ تھی کہ انگریزوں کو اس بات کا قائل کیا جائے کہ مسلمان من حیث القوم ان کے دشمن نہیں ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے دوران بہت سے خیر خواہ مسلمانوں نے اپنی جانوں پر کھیل کر انگریزوں کو بچایا تھا۔ مسلمانوں کو یہ تبلیغ کی کہ عیسائیت کی تعلیمات دوسرے تمام مذاہب کے مقابلے میں اسلامی تعلیمات سے زیادہ قریب ہیں اور اسلام نے عیسائیوں کے ساتھ ربط ضبط سے مسلمانوں کو منع نہیں کیا۔

چونکہ کسی قوم کی اہمیت کا انحصار اس کی اقتصادی حالت پر ہوتا ہے اور مسلمان بہت مفلوک الحال ہو چکے تھے اس لیے سرسید نے ان کے اقتصادی حالات کو بہتر بنانے کے لیے جدید تعلیم دینے کا منصوبہ بنایا۔ سرسید کا خیال تھا کہ انگریز ہندوستان پر طویل عرصے کے لیے قابض ہو چکے ہیں اور مستقبل بعید میں بھی ان سے خلاصی پانا ممکن نہیں ہوگا اس لیے یہ امر مجبوری ان کے قریب ہونا پڑے گا ورنہ ہندو قوم تمام اقتصادی فوائد حاصل کر لے گی اور تمام ملازمتوں پر ان کے افراد فائز ہو جائیں گے اور بالآخر مسلمانوں کو عملاً اچھوت بنا لیا جائے گا۔ اس انجام سے بچنے کے لیے ایک طرف انھیں انگریزی تعلیم دینا ہوگی اور دوسری طرف انھیں وقتی مصالح کے سبب انگریزوں سے قریب لانا ہوگا۔

سرسید کی تفسیر قرآن کا بڑا سبب یہ تھا کہ مغرب سے مشنریوں کی یلغار ہندوستان میں ہو رہی تھی جو ہندوستان کے مذاہب خصوصاً اسلام کے معتقدات اور شخصیات پر بڑی بے رحمی سے تنقید کرتے تھے اور چونکہ مسلمان علماء جدید سائنسی ترقیات سے بے خبر تھے اور ان کا خاطر خواہ جواب نہیں دے سکتے تھے اور عیسائیت پھیلتی جا رہی تھی اس لیے اس کی تردید کے لیے جدید علم الکلام کی ضرورت تھی۔

سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی اصلاح کے لیے جو کوشش کا نا وہ انھی مصلحتوں کے پیش نظر تھا۔ ان کی تعلیمی کوششوں کا آغاز ۱۸۵۸ء سے ہوا۔ ۱۸۶۴ء سے ان کوششوں میں باقاعدگی پیدا ہوئی جب غازی پور میں انھوں نے ایک انگریزی سکول قائم کیا۔ پہلے وہ اردو ذریعۂ تعلیم کے حامی رہے۔ چند سال بعد انھیں اندازہ ہوا کہ بڑے عہدے حاصل کرنے کے لیے انگریزی تعلیم ضروری ہے تو وہ انگریزی ذریعۂ تعلیم کی حمایت کرنے لگے۔ ۱۸۶۹ء میں قیام انگلستان کے دوران جب انھوں نے وہاں کے بہترین تعلیمی اداروں مثلاً کیمبرج اور

آکسفورڈ کو دیکھا تو یہ ادارے ان کا آئیڈیل بن گئے۔ اس دوران وہ انگریزی کے ذریعے تعلیم دینے کے اور زیادہ حامی ہو گئے۔ واپس آکر انھوں نے اسی ماڈل پر ایک بڑا تعلیمی ادارہ قائم کرنے کے لیے علی گڑھ کے قصبے کو منتخب کیا۔ چنانچہ وہاں ۸؍جنوری ۱۸۷۷ء کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ جس کے پرنسپل انگریز ہوا کرتے تھے۔ کئی انگریز اساتذہ کے ساتھ کچھ دیسی لوگ بھی ریاضی اور سائنس کی تعلیم دیتے تھے البتہ زبانوں مثلاً سنسکرت، عربی، فارسی وغیرہ کی تدریس کے لیے قدرتی طور پر دیسی اساتذہ کا تقرر کیا جاتا تھا۔ انگریز پرنسپل کا براہِ راست رابطہ وائسرائے ہند سے ہوتا تھا۔ پرنسپل کالج کے انتظامی معاملات میں سب سے زیادہ اختیار رکھتا تھا اور ادارے کی انجمن کے سیکرٹری جنرل کے تعاون سے تعلیمی، امتحانی اور ہم نصابی سرگرمیوں کی منصوبہ بندی کرتا تھا۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج سے فارغ التحصیل ہونے والے مسلمانوں کی نئی پود عموماً مغربی تہذیب کو آئیڈیل سمجھنے لگتی تھی۔ انھیں اچھی ملازمتیں حاصل ہو جاتی تھیں اور وہ اپنے طرزِ بود و ماند میں ہندوستان کے انگریزوں کی پیروی کرنے لگتے تھے۔ ان کا لباس، گھروں کی آرائش، بول چال، نظریات و اذواق میں مغرب کا رنگ جھلکنے لگ جاتا۔

چند سال بعد کے بعض مسلمان رہنماؤں اور دانش وروں نے اس گروہ کی عادات اور انداز و روش پر شدید تنقید کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ نئی پود ہم سے مختلف ہو گئی ہے۔ یہ نہ انگریز بن سکے ہیں اور نہ ہی دیسی رہے ہیں۔ یہ تنقید اس لحاظ سے مناسب نہیں ہے کہ جدید تعلیم کے بانی انھیں انگریز نہیں بنانا چاہتے تھے اور جب انھیں ایک خاص قسم کی لبرل تعلیم دی جاتی تھی اور لبرل فضا میں تربیت حاصل ہوتی تھی تو وہ قدیم ہندوستانی معاشرے کے مسلمانوں جیسے نہیں بن سکتے تھے؟ دراصل جب بھی کسی سماجی، سیاسی، معاشرتی یا مذہبی تحریک کا آغاز ہوتا ہے تو زمانے کے حالات کو دیکھتے ہوئے ایک لائحہ عمل تیار کیا جاتا ہے اور اس کے مطابق اذہان تیار کیے جاتے ہیں۔

سرسید نے جو کچھ کیا ان حالات میں وہی ضروری تھا۔ سوچا جائے تو اس کا کوئی بہتر متبادل لائحہ عمل دکھائی نہیں دیتا۔ ایک نقطۂ نظر یہ تھا کہ فرنگی سے مصالحت کی بجائے اس کے خلاف ہتھیار اٹھائے جائیں۔ یہ حربہ ناکام ہو چکا تھا۔ سید احمد بریلوی کی تحریکِ جہاد سکھوں سے شکست کھا چکی تھی۔ انگریزوں کی طاقت سکھوں سے بہت زیادہ تھی۔ ان کے خلاف ان حالات میں جہاد کرنا مزید تباہی کو دعوت دینا تھا۔ ایک نقطۂ نظر یہ تھا کہ اصل اسلام کی طرف واپسی کے ذریعے مسلمانوں کی معاشرتی خرابیوں کی اصلاح کی جائے۔ سرسید سے الگ ہو کر شبلی نعمانی نے اس نقطۂ نظر کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ اکبرالہ آبادی بھی بنیادی طور پر اسی نظریے کے حامی تھے

اور علامہ اقبال نے بھی بعد ازاں اسی کی تبلیغ کی ۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق اسلام جب ہندوستان میں آیا تو اس میں بہت سے غیر اسلامی عناصر داخل ہو گئے ۔ عجمی اور ہندو عقائد نے مسلم سوسائٹی کے مزاج کو تبدیل کر دیا۔ انھوں نے بے شمار ایسے رسوم و رواج اپنا لیے جو قبل از اسلام کے ایران میں آتش پرستوں کے ہاں رائج تھے یا ہندوستان میں ہندو سوسائٹی کا جزو لازم تھے۔ رفتہ رفتہ انھیں اسلام سمجھا جانے لگا اور انھی غیر اسلامی عناصر نے ہندوستان کے مسلمانوں میں ہر قسم کی خرابیاں پیدا کیں ۔ یوں تو یہ نقطۂ نظر خاصہ پرانا ہے لیکن شاہ ولی اللہ نے اسے اتنے پر زور انداز میں حجۃ اللہ البالغہ میں پیش کیا کہ اسے بہت سے دیگر مسلم مفکرین نے بھی اپنا لیا۔

سرسید کے رفقاء میں سے نذیر احمد اور ان سے بھی زیادہ حالی اسی کے قائل تھے۔ اکبر الہ آبادی نے اپنے کلام میں جا بجا اس کا پرچار کیا ہے کہ اصل اسلام وہی ہے جو عرب میں آنحضورؐ اور خلفائے راشدینؓ کے زمانہ حیات میں رائج تھا۔ علامہ اقبال نے کئی اشعار میں یہی نقطۂ نظر پیش کیا ہے مثلاً وہ کہتے ہیں۔

حرم کے پاس کوئی اعجمی ہے زمزمہ سنج کہ تار تار ہوئے جامہ ہائے احرامی

....

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے جسے بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لیے

....

دل بہ سلمائے عرب باید سپرد تا دمد صبح حجاز از شامِ کُرد

یہی نظریہ ہے جس کا پرچار علامہ اقبال سے پہلے اکبر کر چکے تھے اور اس میں ولی اللٰہی نقطۂ نظر کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اکبر کہتے ہیں۔

معاملہ تھا عرب کا خدائے واحد سے عجم نے واسطہ رکھا شراب و شاہد سے
اُدھر تھی حمدِ خدا ہی سے آشتی دل کو ادھر تھی بحث نزاعِ حمید و حامد سے

نزاعِ حمید و حامد کی ترکیب ان موشگافیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جو صوفیا و علمائے عجم نے اسلامی عقائد کی تشریح و تفسیر میں روا رکھیں ۔ ایک رباعی میں یوں ارشاد فرماتے ہیں ۔

گزرا ہے مری نظر سے سب کا جلوہ سب سے بہتر ہے روز و شب کا جلوہ
کہتا ہے عجم عجم میں جم ہے موجود کہہ دو کہ عرب میں دیکھ رب کا جلوہ

مندرجہ بالا قطعے اور رباعی دونوں میں اس خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ اسلام کے دورِ اولیں میں ُخدا کی وحدانیت‘ عقائد کی بنیاد تھی لیکن جب اسلام ایران میں پہنچا تو عقلی موشگافیوں نے اسے پیچیدہ بنا دیا اور ایرانی

اسلام اپنی سپرٹ (spirit) میں عربی اسلام سے مختلف ہو گیا۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ اصل اسلام کی تعریف پر مسلمان مفکرین کبھی متفق نہیں ہو سکے۔ خصوصاً معتزلہ کا علم الکلام راسخ العقیدہ لوگوں کے لیے بہت پریشان کن ہے۔ چنانچہ جہاں سر سید بہت سی آیات کی تفسیر لکھتے ہوئے معتزلہ کے نقطۂ نظر سے مدد لے کر استدلال کرتے ہیں۔ ان مقامات پر اکثر علمائے اسلام کے ساتھ ساتھ اکبر بھی سر سید سے اختلاف کرتے ہیں۔

اکبرالہ آبادی مغربی فلسفے سے کسی قدر واقف تھے اور معتزلہ کے عقائد سے بھی آگاہ تھے۔ غالباً وہ ان میں سے بعض نظریات کو مانتے بھی تھے۔ بہر طور وہ ان کی پیچیدگیوں سے ضرور آگاہ تھے تاہم ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اس وقت ہندوستان کے مسلمان معاشرتی اور معاشی طور پر زوال کا شکار ہیں لیکن عام آدمی کے مذہبی عقائد برقرار ہیں۔ وہ بیشک مقلد ہیں اور اہل تقلید کے بہت سے عقائد درست نہیں ہیں مثلاً قبر پرستی، پیر پرستی، ارواح کو روز مرہ واقعات میں دخیل سمجھنا، جبر تقدیر کا قائل ہونا وغیرہ۔ تاہم یہ وقت ایسے معاملات پر بحث کرنے کی بجائے ان سے درگزر کرنے کا ہے ورنہ عام آدمی کے عقائد رخصت ہو گئے تو ہندوستان میں مسلمانوں کی قوت اور بھی کم ہو جائے گی۔

ادھر خیال نہیں مصلحانِ نیشن کا کہ فرطِ ضعف نہیں وقت آپریشن کا

جس طرح بہت کمزور شخص کا آپریشن نہیں کیا جاتا اسی طرح سر سید کو بھی اس کمزور اور زوال پذیر قوم کے عقائد کا آپریشن فی الحال نہیں کرنا چاہیے۔

اکبر ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

بحث اس وقت نہیں خانقہ و مسجد کی مگر الحاد سے ارواح پرستی اچھی

جبکہ سر سید یہ سمجھتے تھے کہ عقل سے کام لیے بغیر لوگوں کے توہمات دور نہیں ہو سکتے اور جب تک یہ توہمات ختم نہیں ہوتے، قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ سر سید کی مخالفت کی بہت بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ ان معاملات میں بھی شدت سے اجتہاد پر مائل تھے جنھیں اس وقت چھیڑنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ مثلاً معجزات کا انکار انھوں نے جس شد و مد سے کیا ہے وہ کئی جگہ کمزور استدلال پر مبنی ہے۔ قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ کے معجزات مختلف آیات میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں سے اکثر کی عقلی توضیح نہیں ہو سکتی اور اگر اس کی کوشش کی جائے تو دلائل کمزور اور بودے معلوم ہوتے ہیں۔ بے شک سر سید قرآن کو خدا کا قول اور نیچر کو اس کا فعل قرار دینے کے نقطۂ نظر کے حامل تھے لیکن اس

سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ قادرِ مطلق قوانینِ قدرت کو معطل کر کے خارقِ عادت واقعات کو وجود میں نہیں لا سکتا مگر سر سید چونکہ یہ سمجھتے تھے کہ خدا نے 'لاء آف نیچر' بنا دیا ہے اور کائنات میں ان قوانینِ قدرت کے برخلاف کچھ نہیں ہوتا اس لیے معجزات کی عقلی توجیہہ ضروری ہے۔ بالفرض یہ نظریہ درست بھی ہے تو ان مخصوص حالات میں اسے اتنی شدت سے رائج کرنے کی کوشش مستحسن نظر نہیں آتی۔

اکبر کو سرسید سے جو چند بنیادی اختلافات ہیں وہ یہ ہیں:

ا۔ سرسید نے جس قسم کا تعلیمی نظام رائج کیا ہے وہ اوّل: انگریزی حکومت سے وفاداری سکھاتا ہے۔ دوم: اس سے ایسے افراد پیدا ہو رہے ہیں جو مغربی افکار کی تقلید کرتے ہیں مگر ان میں تحقیق و تجسس کے ذریعے دریافت و ایجاد کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ سوم: وہ ہر بات میں مغرب کو سند سمجھنے لگ جاتے ہیں اور اپنی ہر چیز کو ناپسند کرنے کا رویہ اپنا لیتے ہیں۔ چہارم: ان میں ایک احساسِ برتری پیدا ہو جاتا ہے اور باقی ماندہ قوم کو پست اور کم عقل سمجھنے لگتے ہیں۔ پنجم: مغرب کی ترقیات سائنسی تحقیق اور محنت و جستجو کی وجہ سے ہے مگر ہمارے تعلیمی اداروں کے فارغ التحصیل لوگ انگریزوں کے بنگلوں، ان کے سامانِ آرائش، طرزِ بود و ماند کو اپنا ماڈل بنا لیتے ہیں مگر ان کی طرح سائنس، ٹیکنالوجی، اقتصادیات وغیرہ میں مہارت حاصل کرنے کے لیے کچھ نہیں کرتے۔

اکبر کی یہ تنقید مبنی بر حقیقت ہے لیکن سرسید کے دفاع میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرسید نے جب تعلیمی میدان میں جد و جہد کا آغاز کیا اس وقت حالات اتنے خراب تھے کہ ایک آئیڈیل تعلیمی نظام قائم کرنا بے حد مشکل تھا۔ اگر ایسا کرنے کی کوشش کی جاتی تو مزید بہت وقت گزر جاتا۔ اس کے باوجود یہ بھی ممکن ہے کہ اس قسم کا مثالی نظام بنایا ہی نہ جا سکتا۔ دراصل تعمیری مرحلے 'آئیڈیلزم' کی بنیاد پر شروع نہیں کیے جا سکتے۔ ان کے لیے معروضی حالات کو سامنے رکھنا ہوتا ہے اور فوری فائدے (immediate gain) پر توجہ رکھنی پڑتی ہے۔ اگر آغاز حوصلہ افزا ہو اور اس سے فوری مقاصد کے حصول کا آغاز ہو جائے تو منصوبے کو بہتر بنانے کی گنجائش بہر حال موجود ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ اکبر الہ آبادی کی تنقید بظاہر درست معلوم ہوتی ہے لیکن تنقید کرنا سہل ہوتا ہے اور عملی دشواریوں پر قابو پا کر کسی تحریک کو درست سمت میں چلانا اور اس سے فوری مقاصد حاصل کرنا زیادہ ضروری ہوتا ہے۔

اکبر الہ آبادی سرسید احمد خاں سے تقریباً تیس سال چھوٹے تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ وہ سرسید سے ایک نسل بعد کے آدمی تھے۔ سرسید تحریک سے جو فوری فوائد مسلمانانِ ہند کو ہوئے، ان کے ثمرات اکبر نے دیکھے۔ مسلمان معمولی ملازمتوں کے حصول کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کے عہدوں پر فائز ہونے لگے۔ انیسویں صدی کے آخری چند برسوں میں کتنے ہی مسلمان اعلیٰ انتظامی عہدوں پر کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان میں خود اکبر

الہ آبادی بھی ہیں جو ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے اہم عہدے پر فائز رہے۔ وہ بیشک علی گڑھ کالج کے تربیت یافتہ نہیں تھے لیکن بہر حال اس فضا سے فائدہ اٹھانے والوں میں تھے جو سرسید تحریک نے پیدا کی تھی لیکن سرسید احمد خان کے انیسویں صدی کے آخر (۱۸۹۸ء) میں انتقال کے بعد اور بیسویں صدی کے آغاز کے چند برسوں میں ہی حالات میں بڑی تبدیلیاں آنا شروع ہوگئی تھیں۔ عدالتوں میں ناگری رسم الخط میں لکھی ہوئی درخواستوں کی اجازت، ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال اور چھ برس بعد اس کی تنسیخ، ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام، جداگانہ انتخابات کا مطالبہ، سودیشی تحریک اور برطانوی مال کا بائیکاٹ، کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان معاہدۂ لکھنو، (۱۹۱۶ء) بلقان میں جنگیں، پہلی عالمی جنگ اور اس کے ہندوستان کی سیاست پر اثرات، تحریک خلافت اور تحریکِ ہجرت افغانستان _____ وغیرہ نے سرسید کی اپنائی ہوئی حکمتِ عملی پر عملاً خطِ تنسیخ پھیر دیا تھا۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے تک سیاست چھائی ہوئی تھی اور سرسید کا مسلمانوں کو سیاست سے دور رہنے کا مشورہ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے غیر موثر ہو کر رہ گیا تھا۔

انھی حالات کی وجہ سے علی گڑھ کے اکابرین کو بھی سیاست میں حصہ لینا پڑا تھا چنانچہ علی گڑھ اور مسلم معاشرے کے بارے میں اکبرالہ آبادی کے سرسید سے اختلافات کو اس پس منظر میں دیکھنا پڑے گا۔ سرسید نے علی گڑھ سے فارغ التحصیل مسلمانوں کو برطانوی حکومت کی وفاداری کے خیال سے تیار کیا تھا لیکن حکومت کے بہت سے اقدامات نے مسلمانوں کو ان سے برگشتہ کر دیا تھا۔ اکبرالہ آبادی بنیادی طور پر شاعر تھے۔ وہ ان حالات کی عکاسی اپنی شاعری میں کرتے رہتے تھے۔ حالات کی رو کبھی ایک سمت میں بہنے لگتی اور کبھی دوسری سمت اختیار کر لیتی اس لیے اکبر کے ہاں کسی ایک نقطۂ نظر کو تلاش کرنا ممکن نہیں۔ اگر لکھنو پیکٹ اور تحریکِ خلافت کے ایام میں ہندو مسلم بھائی بھائی کا جذبہ پیدا ہوا تھا تو چند سال پہلے ناگری خط کی تحریک اور تقسیم و تنسیخ بنگال سے دونوں قوموں میں شدید اختلافات بھی پیدا ہو چکے تھے اس لیے اکبر کے ہاں کہیں دو قوموں کے سلسلے میں سرسید کے نقطۂ نظر سے اتفاق ملتا ہے تو کہیں تحریکِ خلافت کے سلسلے میں کانگرس اور گاندھی سے اتفاق دکھائی دیتا ہے۔

ہندو مسلم تعلقات کے سلسلے میں اکبر کے چند اشعار:

امورِ ملکی کی بحث میں تم جو ہندوؤں کے ہو گے ساتھی
نہ لاٹ صاحب خطاب دیں گے نہ راجہ جی سے ملے ہاتھی
نہ اپنا مکھن وہ تم کو دیں گے نہ اپنی پوری وہ بانٹ دیں گے
پڑے گا موقع جو کوئی آ کر تو دونوں ہی تم کو چھانٹ دیں گے

مگر وہ رہتے ہیں دور تم سے یہ لوگ ساتھی ہیں اور پڑوسی
ملے جلے ہیں سوسائٹی میں اہیر اُن میں تو ہم میں گھوسی
ہزل کو اپنی جو چھوڑ کر تم انھی کی شرکت کرو زٹل میں
تو یہ تو کوئی نہ کہہ سکے گا تمھارے دشمن کہاں بغل میں
نہ ہوگی حکام کو بھی دقت جو ہوگی اک جاہر اک کی خواہش
ضرورت ان کو بھی یہ نہ ہوگی کریں ہر اک سے علیحدہ غرش

گویا اکبر کے خیال میں مسلمانوں کے لیے یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے کہ انھیں انگریزوں کا ساتھ دینا چاہیے یا ہندوؤں کا۔ سیاسی جماعت میں ہندوؤں کا ساتھ دیا جائے تو انگریز ناراض ہوں گے لیکن اس کے باوجود ہندو خوش نہیں ہوں گے۔ دراصل ہندو اکثریت کے بل پر انگریزوں کے جانے کے بعد ان کی جگہ خود حکمران بننا چاہتے تھے۔ اس کے باوجود اکبر سمجھتے تھے کہ ہندوؤں کا ساتھ دینا انگریزوں کا ساتھ دینے سے بہتر ہے کیونکہ ہندو اور مسلمان ایک ہی خطے میں رہتے ہیں اور انگریز غیر ملکی ہیں۔ اس نظریے کے پیچھے یہ جذبہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کا ساتھ دیا جائے تو شاید ان کی مسلم دشمنی اعتدال کا راستہ اختیار کر لے۔ اسی طرح کا ایک قطعہ یہ بھی ہے:

زیادہ ان سے رہو محترز کہ ہندو سے ــــ یہ خود ہی سوچ لو دل میں اگر نہ کچھ کد ہو
یہ چاہتے ہیں کہ ختنہ میاں کا ہو موقوف ــــ وہ فکر میں ہیں مسلمانی ہی نذارد ہو

یعنی ہندو چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنی دینی علامات ترک کر دیں اور انگریز مسلمانوں ہی کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مسلمان اپنی دینی علامات ترک کر دیں تو رفتہ رفتہ ان میں اور ہندوؤں میں کیا فرق رہے گا؟ جواب یہ ہے کہ کوئی فرق نہیں رہے گا اس لیے ہندو یا انگریز میں کسی ایک کو ترجیح دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

لیکن جب ہندو ناگری تحریک کے ذریعے مسلمانوں کو عدالتی نظام سے باہر نکالنے کی کوششوں میں پر زور طریقے سے شریک ہوئے تو اکبر نے اس طرح کے ردِعمل کا اظہار کیا:

''ہندوستان کا پالیٹکس بہت پیچیدہ اور مشکل اور خطرناک ہوتا جاتا ہے۔ اردو یونیورسٹی بھی اس میں داخل ہے۔ ہندو کا ہوم رول اور ذوقِ ہندی بھی اسی میں

داخل ہے۔''

(خطوطِ مشاہیر ــــ بنام عبدالماجد دریابادی)

''ہندوؤں کی یہ بے امتیازی دیکھ کر ایک بات تسکین دہ ضرور دل میں آتی ہے کہ ایسی قوم کو غلبہ نہیں ہوسکتا۔''

(خطوطِ مشاہیر ــــ بنام عبدالماجد دریابادی)

اسی طرح جب جوشِ جذبات میں مولانا محمد علی جوہر نے کہہ دیا کہ انگریز کو نکالنے کے لیے کابل سے بھی مدد لینی پڑی تو لیں گے، اس پر گاندھی سمیت ہندو لیڈروں کا ردِعمل بڑا شدید تھا اور گاندھی نے کہا کہ یہ 'محمود شاہی' کو زندہ کرنے کی کوشش ہے۔ اس پر اکبر کا خیال تھا کہ اس قسم کے بیانات کا مقصد یہ ہے کہ انگریز افغانستان پر بھی قبضہ کر لیں۔

ہضم کابل کا بھی حیلہ چاہیے   بھائی گاندھی کا وسیلہ چاہیے

گویا اکبر بالآخر سیاسی نظریات میں سرسید اور ان کے رفقائے علی گڑھ کے قریب آ گئے۔

اکبرالہ آبادی نے علی گڑھ کے نظامِ تعلیم اور ایم-اے-او کالج کے فارغ التحصیل لوگوں پر جو تنقید کی ہے اس کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ سرسید نے جس قسم کی تعلیم قوم کو دلائی اس سے بعض مسلمانوں کی اقتصادی حالت ضرور بہتر ہوئی۔ لوگوں کو ملازمتیں ملیں تو ان کے مصائب میں کمی آئی لیکن چونکہ اس قسم کی تعلیم کا کوئی بڑا مقصد نہیں تھا اس لیے لوگ معمولی ملازمتوں پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے اور مجموعی طور پر ترقی نہیں ہوئی۔

مجموعی قومی ترقی کے لیے ایسی تعلیم ضروری تھی جس سے طلبہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں اتنی مہارت حاصل کریں کہ خود نئی چیزیں ایجاد کر سکیں اور علوم و فنون میں نئے نئے نظریات پیش کر کے عملی طور پر قوم کی پیش رفت کے لیے بنیاد تیار کریں۔ علی گڑھ کالج کی تعلیم نے ان اہم مقاصد کو نظر انداز کر کے محض وقتی مصلحتوں کو مدِنظر رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بزور زر بعض لوگ مغربی ایجادات سے استفادہ کرنے لگے مگر خود کسی ایجاد کے قابل نہ ہوئے اکبر نے نہایت مناسب بات کہی ہے:

عزم کر تقلیدِ مغرب کا ہنر کے زور سے   لطف کیا جو لد لیے موٹر پہ زر کے زور سے
غیر ملکوں میں ہنر کو سیکھ تکلیفیں اٹھا   روکتے ہیں وہ اگر اپنے اثر کے زور سے

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو باتیں جو بری ہیں ان سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر اس میں کیا ہے جو نقلِ انگریز کرو

اس طرح درج ذیل رباعی میں بھی اسی نقطۂ نظر کو پیش کیا گیا ہے:

تکمیل میں ان علوم کے ہو مصروف نیچر کی جو طاقتوں کو کر دیں مکشوف
لیکن تم سے امید کیا ہو کہ تمھیں عہدہ مطلوب ہے وطن ہے مالوف

ذیل کا بند اس نظریے کو اور زیادہ واضح کرتا ہے۔

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور سیکھو اٹھو تہذیب سیکھو صنعتیں سیکھو ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے اطراف دنیا میں سفر سیکھو خواصِ خشک و تر سیکھو علومِ بحر و بر سیکھو
خدا کے واسطے اے نوجوانو ہوش میں آؤ
دلوں میں اپنے غیرت کو جگہ دو جوش میں آؤ

اکبر کے ہاں یقیناً ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جن میں انھوں نے سائنسی علوم پر تنقید کی ہے، خصوصاً ڈارون کے نظریۂ ارتقا کے بارے میں ان کے چٹکلے خاصی تعداد میں ہیں۔ ان سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے تک ہندوستان کے اہلِ دانش عموماً ڈارون کے نظریۂ ارتقا سے واقف نہیں تھے اور اس نظریے کو محض یہ سمجھتے تھے کہ بندر ارتقا سے انسان بن گیا ہے حالانکہ یہ نظریہ ارتقائے انواع کا ہے جس میں وقت کی ناقابلِ تصور طوالت کارفرما ہے اور چونکہ مذہبی تعلیمات Special Creation کی حمایت کرتی ہے اس لیے تصورِ ارتقا کو غلط قرار دینے کے لیے چٹکلوں کا سہارا لیا گیا اور اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

سر سید احمد خاں نے ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد پیدا ہونے والے حالات کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر ابتلا کا ایسا وقت آ گیا ہے کہ اگر اندریں حالات ان کی بقا کے لیے فوری طور پر کچھ نہ کیا گیا تو وہ مٹ جائیں گے۔ چونکہ انگریزی حکومت انھیں مٹانے کے درپے تھی۔ مسلمانوں میں مقاومت باقی نہ رہی تھی اور انگریز ہندوستان میں اتنی مضبوطی سے پاؤں جما چکے تھے کہ ان کا غلبہ مستقل نظر آتا تھا اور مسلمانوں کو اس صورتِ حال سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ان کے رہنما، علما اور مصلحین جو کچھ کر رہے تھے وہ تباہی کا راستہ تھا چنانچہ انھوں نے مسلمانوں اور انگریزوں کو قریب لانے کا منصوبہ بنایا۔ اس کے لیے انھوں نے انگریزوں کو بتایا کہ ۱۸۵۷ء کے دوران بہت سے مسلمانوں نے انگریزوں سے وفاداری کی اور ان کے افراد کی جانیں بچائیں اور ان کے اموال وغیرہ کی حفاظت کی اور مسلمانوں کو یہ بتایا کہ ازروئے اسلام مسلمان اور عیسائی

دیگر تمام مذاہب کے مقابلے میں زیادہ قریب ہیں اور دونوں کی الہامی کتابیں ایک جیسی تعلیم دیتی ہیں اس لیے انگریزوں سے مغائرت اختیار کرنا صحیح نہیں ہے۔ علاوہ ازیں سرسید نے مصالح وقت کو سامنے رکھ کر مسلمانوں کو ایسی تعلیم دینے کا منصوبہ بنایا جس سے وہ ملازمتیں حاصل کر کے اپنی معاشی حالت بہتر بنائیں۔ سیاست سے دور رہیں تاکہ ۱۸۵۷ء جیسے حالات دوبارہ پیدا ہونے کی صورت میں وہ حکومت کے غیظ وغضب سے بچ سکیں۔ ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ جانے کی وجہ سے ان کا مستقبل تاریک ہو چکا ہے اب وہ اپنے تابناک مستقبل کے لیے ہندوؤں سے الگ رہ کر اپنا تشخص بحال کریں۔

جدید سائنسی دریافتوں اور مشنریوں کی یلغار کے باعث خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ مسلمان دین سے بیگانہ ہو جائیں گے اس لیے سرسید نے یہ بتایا کہ اسلامی عقائد نیچر کے مطابق ہیں (rational) اور نئی سائنسی دریافتوں سے انھیں کوئی خطرہ نہیں اس لیے قرآن کی تفسیر عقل اور استدلال کے ذریعے کرنی چاہیے۔

سرسید نے اس تحریک کے ذریعے مسلمانوں کے اقتصادی حالات کو یقیناً بہتر بنایا، ان کے لیے ایک ایسا پلیٹ فارم بھی بنا دیا جہاں سے وہ انگریزی پالیسی کی حمایت کر کے ملک کے انتظامی ڈھانچے میں اپنی حیثیت منوا سکیں۔ بعض اونچے عہدوں پر بھی مسلمان نظر آنے لگے اور معمولی ملازمتوں میں ان کی تعداد میں اپنی آبادی کے تناسب کے مطابق کافی اضافہ ہوا۔ یہ سب کارہائے نمایاں ایسے ہیں جن کا سہرا سرسید کے سر ہے۔ سرسید کی ان اصلاحی کوششوں کے آغاز سے ان کے انتقال تک تقریباً تیس پینتیس برسوں میں ہندوستانی مسلمانوں میں ایک نئی مڈل کلاس ابھرنے لگی تھی۔ آئندہ نسلیں بعدازاں مزید برگ وبار لائیں اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مسلمان اپنی اہمیت کا احساس دلانے میں کامیاب رہے لیکن رفتہ رفتہ اس حکمت عملی کے کچھ منفی پہلو بھی سامنے آئے۔ علی گڑھ کے فارغ التحصیل لوگ اپنی ذہانت اور چمک دمک میں نمایاں ہوئے۔ ان میں سے کتنے ہی لوگ تھے جو ملازمتوں میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرنے میں کامیاب رہے۔ سول اور عدالتی عہدوں پر وہ کامیاب رہے۔ نشست وبرخاست، تہذیب ومعاشرت، خطابت واستدلال، کھیل اور سماجی سرگرمیوں میں موثر ہوئے لیکن ان میں کوئی بڑا سائنس دان یا ماہر اقتصادیات پیدا نہ ہوا۔ عموماً سائنسی اور عملی میدانوں میں اوسط درجے سے بلند نہ ہوئے۔ پھر یوں ہوا کہ علی گڑھ کی دوسری نسل کے لوگ انگریز کی پیروی سائنسی اور علمی ترقی کی بجائے لباس، طرز معاشرت، آداب ورسومات میں کرنے لگے۔ مغربی ادب وفکر کے حوالے ان کے روزمرہ میں شامل ہو گئے اور اپنی تہذیب ومعاشرت سے کنارہ کش ہونے لگے۔

شرم مشرق کے عدو شیوۂ مغرب کے شہید   ولولے لے کے نکلنے لگے کالج کے جواں

سر سید اپنی تحریک کو اس انداز میں نہیں چلانا چاہتے تھے لیکن جس انداز میں علی گڑھ کالج کو منظم کیا گیا اس کا نتیجہ یہی نکلنا چاہیے تھا۔

علامہ اقبال سر سید احمد خاں سے تقریباً ساٹھ سال چھوٹے اور اکبرالہ آبادی سے تقریباً تیس سال چھوٹے تھے۔ انھوں نے سیالکوٹ میں جب مولوی میر حسن سے تعلیم حاصل کرنی شروع کی تو علی گڑھ تحریک بار آور ہو چکی تھی۔ پنجاب کے مختلف شہروں میں سر سید تحریک کے بہت سے ہمدرد موجود تھے۔ کئی اسلامی انجمنیں سر سید کے تیار شدہ ماڈل پر وجود میں آ چکی تھیں جو علاقائی بنیادوں پر مسلمانوں میں تعلیم کو پھیلانے میں بہت اچھا کام کر رہی تھیں۔ سر سید احمد خاں نے چار مرتبہ پنجاب کے دورے کیے جو ۱۸۷۳ء سے ۱۸۹۴ء کے درمیان ہوئے۔ خاص طور پر ۱۸۸۴ء اور اس کے بعد ۱۸۸۸ء میں سر سید نے پنجاب کے جو دورے کیے انھوں نے مختلف شہروں میں بڑی ہلچل پیدا کی اور بہت سے لوگ ان کی تحریک کے ہمدرد بن گئے۔ لدھیانہ، جالندھر، امر تسر، گورداسپور، لاہور وغیرہ میں انھوں نے ممتاز مسلمانوں سے ملاقاتیں کیں۔ سر سید کے اعزاز میں جلسے منعقد کیے گئے اور بہت سی پارٹیوں کا اہتمام کیا گیا۔ سر سید اس پذیرائی سے بہت خوش ہوئے اور اہل پنجاب کو زندہ دلانِ پنجاب کا خطاب دیا۔ علامہ اقبال کے استاد اور مربی مولوی میر حسن سر سید کی تحریروں کے مداح اور ان کی تحریک کے بڑے پر جوش حامی تھے۔ سر سید احمد خاں اور ان کے احباب سے ان کے تعلقات تھے اور تبادلۂ مکاتیب بھی ہوتا تھا۔ میر صاحب نے شاہ ولی اللہ کے فارسی ترجمۂ قرآن میں سفید اوراق لگا کر اس کے مدِ مقابل سر سید کی تفسیر قرآن سے ترجمہ درج کیا تھا۔

سر سید کے دورۂ پنجاب سوم اور چہارم کے زمانے میں اقبال میر حسن سے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ میر حسن اپنے طلبہ کو سر سید تحریک اور اس کے مقاصد سے آگاہ کرتے تھے۔ اقبال تو ان کے خصوصی شاگرد تھے اس لیے لازماً اقبال نے سر سید اور ان کی تحریک کے بارے میں میر حسن سے بہت کچھ سنا ہوگا اور آٹھ دس سال کے اس طالب کو تحریک علی گڑھ کے مقاصد سے ہمدردی پیدا ہوگئی ہوگی۔

۲۸ دسمبر ۱۸۸۹ء کو لاہور میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا اجلاس ہوا جس میں سر سید شریک ہوئے۔ میر حسن بھی خاص طور پر سیالکوٹ سے آئے۔ غالباً بارہ سالہ اقبال ان کے ساتھ نہیں آ سکے تھے۔ بہر حال میر حسن کی سر سید سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد بھی میر حسن ایک یا دو بار سر سید سے ملے۔ اس زمانے کی فضا میں سر سید احمد خاں سے مسلمان نوجوانوں کا ذہنی قرب باعثِ تعجب نہیں۔ جب اقبال ۱۸۹۶ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں بی-اے کے طالب علم بنے تو لاہور کے پڑھے لکھے مسلمانوں میں سر سید تحریک سے ہمدردی کا

جذبہ عام تھا۔ ۱۸۸۴ء کے سال لاہور میں انجمن حمایت اسلام کا قیام ہو چکا تھا۔ انجمن کی تعلیمی کاوشوں نے مسلمانوں کو متوجہ کر رکھا تھا اور اقبال کے قیام لاہور کے دوران انجمن اپنے مقاصد کے حصول میں کامیابیاں حاصل کر رہی تھی۔ انجمن کے سالانہ جلسوں میں رفقائے سرسید میں سے حالی، نذیر احمد اور دوسرے اہم لوگ شرکت کرتے تھے۔ اقبال بھی عملی طور پر انجمن کی سرگرمیوں میں شریک تھے اور ۱۹۰۰ء میں انجمن کے سالانہ جلسے میں نظم 'نالۂ یتیم' پڑھ کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

۱۸۹۸ء میں جب سرسید کا انتقال ہوا تو انجمن نے ایک بڑا تعزیتی جلسہ کیا جس کا تذکرہ مولانا حالی نے حیاتِ جاوید میں کیا ہے اور یہ معلومات بھی فراہم کی ہیں کہ اس میں سرسید کی خدمات پر ٹامس آرنلڈ نے تقریر کی تھی۔ اقبال اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں فورتھ ایر کے طالب علم تھے۔ آرنلڈ لاہور آنے سے پہلے علی گڑھ میں استاد تھے اور سرسید سے قریبی رابطہ رکھتے تھے۔ اقبال اور آرنلڈ کے تعلقات کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ ان سب حالات و واقعات نے اقبال کو سرسید کی خدمات کا قدر دان بنا دیا اور انھوں نے علی گڑھ کالج کو مسلمانوں کے عروج کی علامت سمجھنا شروع کر دیا تھا۔

بانگِ درا کے حصہ اوّل میں سید کی 'لوحِ تربت' کے نام سے ایک نظم شامل ہے جو اقبال نے ۱۹۰۲ء کے آخر میں لکھی تھی، اس میں سرسید کی خدمات، ان کے نظریات اور ان کی ذاتی خصوصیات کو بڑے اچھے الفاظ میں خراجِ تحسین ادا کیا گیا ہے۔

دوسری نظم جو بانگِ درا حصہ دوم میں 'طلبائے علی گڑھ کے نام' سے شائع ہوئی ہے اس وقت لکھی گئی جب اقبال یورپ میں زیرِ تعلیم تھے۔ ۱۹۰۷ء کے آغاز سے علی گڑھ کالج میں انگریز پرنسپل کے رویے کی وجہ سے پے در پے ایسے واقعات ہوئے کہ طلبا احتجاج پر مجبور ہوئے۔ محسن الملک ان دنوں بورڈ آف ٹرسٹیز کے سیکرٹری تھے جو بڑے نرم خُو انسان تھے۔ پرنسپل نے احتجاج کرنے والے چھ طلبہ کو کالج سے خارج کر دیا۔ چنانچہ طلبہ میں مزید ہیجان پیدا ہوا اور ہڑتال بھی ہوئی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ انگریز پرنسپل کو نکالا جائے۔ محسن الملک اور دوسرے ٹرسٹی ابھی انگریزوں سے تصادم نہیں چاہتے تھے اس لیے وقار الملک کی مخالفت کے باوجود ٹرسٹیز نے مصلحت اندیشی کا رویہ اختیار کیا۔ اقبال نے بھی اس نظم میں طلبہ کو یہی مشورہ دیا تھا کہ ابھی انگریزوں سے ٹکراؤ کا وقت نہیں آیا۔ نظم کا آخری شعر ہے:

بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی   رہنے دو خُم کے سر پہ تم خشتِ کلیسیا ابھی

اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اقبال کو سرسید کے قائم کیے ہوئے اس ادارے سے کتنی دلچسپی تھی اور یہ کہ اس

وقت تک وہ مسلمانوں کے لیے سرسید کی اختیار کردہ پالیسی کو درست خیال کرتے تھے۔

۱۹۰۸ء میں اقبال یورپ سے واپس آئے۔ ان کے ہاں پین اسلامزم کا جذبہ غالب آنے لگا۔ بانگ درا کے دورِ سوم کی پہلی نظم 'بلادِ اسلامیہ' میں اسلامی تہذیب کے اہم شہروں میں سے دہلی، بغداد، قرطبہ اور استنبول (قسطنطنیہ) کا ذکر کرنے کے بعد مدینہ کو مرکزِ اسلام قرار دیا گیا ہے۔ پھر گورستانِ شاہی میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ ملتِ اسلامیہ گو زوال کا شکار ہے لیکن اب بھی مذہبِ اسلام دنیا کے صحرا کو گلزار بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور نظم کا اختتام اس شعر پر کیا ہے۔

ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

اگر چہ یہ شعر پوری طرح واضح نہیں۔ شانِ جلالی سے مراد تو اسلامی فتوحات کا دور ہے لیکن شانِ جمالی سے کیا مراد ہے؟ بقول مہر اس سے غالباً مراد یہ ہے اسلام کی معنوی خوبیاں نمایاں ہونے کا دور ابھی آنا ہے۔ لیکن مہر کی توضیح بھی مبہم ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا نظامِ اقدار دنیا میں رائج ہو جائے تو دنیا سنور جائے گی یا اس سے یہ مفہوم نکالا جائے کہ اسلامی تہذیب و ثقافت کا ظہور ابھی باقی ہے ___ لیکن غالباً وسیع خطے پر غلبہ حاصل کیے بغیر جسے شانِ جلالی کہیے، شانِ جمالی کا ظہور بھی ممکن نظر نہیں آتا۔ بانگ درا کے تیسرے حصے کی بہت سی نظموں میں یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ اسلام جدید زمانے کے تقاضوں کا پوری طرح ساتھ دے سکتا ہے مگر مسلمان اس قابل نہیں رہے کہ اسلام کی خوبیوں کو اپنائیں اور اس کی برکتوں سے نوعِ انسانی کو مستفید کریں کیونکہ وہ تارکِ آئینِ آبائی ہو کر رہ گئے ہیں۔ اسی زمانے کی مشہور نظم 'ترانۂ ملی' ہے جس میں بلادِ اسلامیہ ہی میں پیش کیے گئے خیال کو ایک اور اسلوب میں یوں پیش کیا گیا ہے۔

اے ارضِ پاک تیری حرمت پہ کٹ مرے ہم ہے خوں تری رگوں میں اب تک رواں ہمارا
سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

اسی دور میں اقبال نے وطنیت کے مغربی تصور کے خلاف نظمیں لکھیں اور مسلمانوں کو ملی تصور اپنانے کا مشورہ دیا۔ سیاسی طور پر یہ زمانہ عالمِ اسلام کے لیے انتہائی زوال کا شکار تھا اس لیے اقبال کی نظموں میں بار بار یہ تصور ابھرتا ہے کہ فرد کو اپنی جماعت کے ساتھ دورِ ادبار میں وفادار رہنا چاہیے۔ اسے اپنے شاندار ماضی کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

چونکہ سرسید اسلام کے ماضی کے کارناموں کو روحانی عظمت و شان سے پیش نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی پوری توجہ زمانۂ حال کے واقعات پر مرتکز کیے ہوئے تھے اور انھی کو تبدیل کر کے ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کو

بہتر بنانا چاہتے تھے اور پین اسلامزم سے روگرداں تھے اس لیے اقبال اپنی افتادِ طبع کے مطابق سرسید کے خیالات سے دوری محسوس کرنے لگے تھے۔ اچانک انھیں اس تاریکی میں اکبرالہ آبادی کی شاعری کی روشنی میسر آ گئی۔

اکبر سے اقبال کے روابط کا آغاز ۱۹۱۱ء سے ہوا۔ اس سال انھوں نے علی گڑھ میں بزبانِ انگریزی ایک خطبہ بعنوان

"The Muslim Community" دیا۔ جس میں اکبر کے بارے میں یہ جملے موجود ہیں:

''جناب مولانا اکبرالہ آبادی جنھیں موزوں طور پر لسان العصر کا خطاب دیا گیا ہے
اپنے بذلہ سنجانہ پیرائے میں ان قوتوں کی ماہیت کے احساس کو چھپائے ہوئے ہیں
جو آج کل مسلمانوں پر اپنا عمل کر رہی ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی دونوں کے درمیان مراسلت کا سلسلہ چل نکلا۔ اقبال نے اپنے کئی خطوں میں اکبر کو لکھا کہ وہ لاہور میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہیں، اکبر کے خطوں کو بار بار پڑھتے ہیں اور ان سے ملاقات کے لیے تڑپتے ہیں۔ اقبال ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں آپ کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی
محبت وعقیدت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ خدا کرے وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ
سے شرفِ نیاز حاصل ہو اور میں اپنے دل کو چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔''

اس مراسلت کے علاوہ اقبال تین بار اکبر کی ملاقات کے لیے الہ آباد بھی گئے۔ دو ملاقاتیں ۱۹۱۳ء میں جب کہ تیسری ملاقات ۱۹۲۰ء میں ہوئی۔ اکبر نے بھی اپنے مکاتیب میں اقبال کے بارے میں بہت اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اسرارِ خودی کی اشاعت کے بعد ۱۹۱۵ء اور اس کے ذرا بعد تصوف کے مسئلے پر اقبال اور ان کے مداحین کا حسن نظامی اور ان کے مداحین کے درمیان تلخ مباحثہ ہوا اور چونکہ حسن نظامی سے اکبر کے بڑے قریبی تعلقات تھے اس لیے انھوں نے بھی بعض دوستوں کے نام خطوط میں اقبال پر تنقید کی لیکن اقبال کی طرف سے اکبر کا احترام بدستور جاری رہا۔ آخر اکبر کی تحریک پر حسن نظامی اور اقبال کی کشیدگی کم ہوئی اور اکبر دوبارہ اقبال کے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار کرنے لگے۔

۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۹ء کے درمیان اقبال نے اپنی نظم ونثر میں سرسید کا ذکر بہت کم کیا ہے بلکہ غالباً بالکل نہیں کیا۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ اس زمانے میں اقبال سید جمال الدین افغانی اور بعض دیگر اسلامی مفکرین سے

قرب محسوس کرنے لگے تھے۔ افغانی سرسید کی حکمتِ عملی کے مخالف تھے جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ ایران، عراق، ترکی، مصر اور شرقِ اوسط کے اسلامی ممالک کے اندر مغرب کی ریشہ دوانیوں کو دیکھ رہے تھے اور انگریز کو مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے جب کہ سرسید کی کوششیں ہندوستانی مسلمانوں کی فلاحِ دنیوی تک محدود تھیں چنانچہ انگریز کے ساتھ تعاون کے بغیر مقصد کا حصول ممکن نہیں تھا لیکن اکبرالہ آبادی اور اقبال دونوں علی گڑھ کی برگ و بار لانے والی جدید تعلیم یافتہ نسلوں کے رویے سے مطمئن نہیں تھے۔ اکبر اور اقبال یہ سمجھتے تھے کہ اگرچہ چند مادی آسائشیں مل گئی ہیں لیکن اس سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ نئی ابھرنے والی خوشحال نسلوں کے یہ افراد مادی خوشحالی ہی کو سب کچھ سمجھنے لگے ہیں۔ ان کے عقائد کمزور ہوئے ہیں یا ان کے دلوں پر تشکیک کا غلبہ ہو گیا ہے۔ انھیں ملتِ اسلامیہ کی فلاح و اصلاح سے کوئی علاقہ نہیں رہا۔ وہ انگریز کو تہذیب و معاشرت میں اپنا آئیڈیل سمجھنے لگے ہیں اور ایک طرح کے 'دیسی انگریز' بن گئے ہیں۔ اکبرالہ آبادی نے سرسید سے بھی زیادہ علی گڑھ کے 'ثمر' پر تنقید کی ہے۔

گزشتند آں قدر یاراں زحدِ سیداے اکبر　　　　کہ آں مرحوم اکنوں در شمارِ شیخ می آمد

(یار لوگ سرسید کی حد سے اتنا آگے نکل گئے ہیں کہ اس مرحوم کو اب مرشد یا پیر سمجھنا چاہیے۔)

اکبرالہ آبادی نے نئے تعلیم یافتہ مسلمانوں پر جو تنقید کی ہے اس کے اہم نکات یہ ہیں کہ (۱) انھوں نے چند معمولی مفادات کے حصول کی خاطر مذہب کو چھوڑ دیا ہے (۲) مغربی تہذیب و معاشرت کی نقالی کرنے لگے ہیں (۳) وہ مغرب کے اچھے نقال بن گئے ہیں لیکن خود نہ نئی ایجادات کر سکے ہیں نہ نئے علمی نظریات دے سکے ہیں (۴) وہ اپنی قوم اور ملت اور ماضی کی ہر بُری بات پر تنقید کرتے ہیں (۵) قومی اور ملی تشخص کو غیر ضروری سمجھنے لگے ہیں اور قومی و ملی علامتوں [مذہب/ادبیات/روایات/لباس/فنونِ لطیفہ] کا مذاق اڑانے لگے ہیں یا سنجیدگی سے اپنی جملہ روایات کو ترقی میں رکاوٹ سمجھتے ہیں۔

اکبر کے نزدیک وہ وقت دور نہیں ہے جب آنے والی نسلیں موجودہ مسلمان نسل سے بالکل مختلف ہو جائیں گی۔ عورتیں مردوں جیسے چھوٹے چھوٹے بال رکھنے لگیں گی، پردہ ختم ہو جائے گا، خوبصورت خطِ نسخ اور نستعلیق لکھنے والے خطاط باقی نہیں رہیں گے، عقیدے رخصت ہو جائیں گے، مغربی نظریات کے بت پوجے جائیں گے، مغربی موسیقی کی یلغار ہو گی اور بے تال و سم، بے جوڑ موسیقی کانوں میں پڑے گی، موجودہ مذہبی اور علمی اصطلاحیں بھلا دی جائیں گی اور مغربی زبانوں (انگریزی) کے الفاظ کوچہ و بازار میں رائج ہو جائیں گے۔ شرافت کا معیار بدل جائے گا اور جو لوگ قدیم اقدار پر قائم رہیں گے وہ معاشرے کے پست ترین افراد سمجھے

جائیں گے (کیونکہ شرافت کا معیار دولت ہو جائے گا) ماضی کی عظمت کا ذکر کرنے سے لوگ شرمائیں گے اور شاندار ماضی کے افسانے کتابوں میں دفن ہو جائیں گے۔ زیادہ المناک بات یہ کہ اس تبدیلی کا لوگوں کو غم ہونا تو درکنار احساس بھی نہ ہوگا۔ کیونکہ ان لوگوں نے جس سازِ مغربی سے وجود پایا اسی کے زیر و بم بن کر رہ جائیں گے۔

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہوں گے   نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی یہ پابندی   نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہوں گے
نہ پیدا ہوگی خطِ نسخ سے شانِ ادب آگیں   نہ نستعلیق حرف اس طور سے زیبِ رقم ہوں گے
عقاید پر قیامت آئے گی ترمیمِ ملت سے   نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے
ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی   لغاتِ مغربی بازار کی بھاکھا سے ضم ہوں گے
بدل جائے گا معیارِ شرافت چشمِ دُنیا میں   زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے
گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے   کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہوں گے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا   ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے
تمھیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبر   بہت نزدیک ہیں وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

اکبر نے مستقبل کے خدشات کے لیے شکیہ کا صیغہ استعمال کیا لیکن اقبال نے اس تغیر کو زیادہ وسیع پیمانے پر دیکھا اس لیے انھوں نے کہا۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا   کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اقبال نے بھی مغرب کے ذہنی اور سیاسی غلبے کے زیر اثر ہونے والی تبدیلیوں کو شدت سے ہدفِ تنقید بنایا۔ انھوں نے بار بار تعلیمی اداروں میں دی جانے والی تعلیم کو انتہائی مضر قرار دیا اور اس میں جدید اور قدیم دونوں اداروں کو شامل کر لیا۔ ان کے ہاں مدرسہ، مکتب اور خانقاہ کی علامتوں کے ذریعے علی گڑھ کی تعلیم سے لے کر مکتبوں اور خانقاہوں میں دی جانے والی تعلیم کے زہریلے اثرات کے خلاف جگہ جگہ اظہارِ خیال کیا گیا ہے:

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم   کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

....

بدلی زمانے کی ہوا ایسا تغیر آ گیا   جو تھے گراں قیمت کبھی اب ہیں متاعِ کس مخر

....

آہ مکتب کا جوانِ گرم خوں ساحرِ افرنگ کا صیدِ زبوں

....

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللّٰہ

....

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

اقبال کے یہ خیالات دراصل اکبر ہی کے نظریات کا عکس ہیں اور اکبر کے ایک مشہور شعر کو اقبال نے سٹریچی ہال علی گڑھ میں دیے گئے خطبے میں ان الفاظ کے ساتھ درج کیا ہے:

''موجودہ نسل کا نوجوان مسلمان قومی سیرت کے اسالیب کے لحاظ سے ایک بالکل نئے اسلوب کا ماحصل ہے، جس کی عقلی زندگی کی تصویر کا پردہ اسلامی تہذیب کا پردہ نہیں ہے... اپنی قومی روایات کے پیرائے سے عاری ہو کر اور مغربی خیالات کے نشے میں ہر وقت سرشار رہ کر اس نے اپنی قومی زندگی کے ستون کو اسلامی مرکزِ ثقل سے بہت پرے ہٹا دیا ہے... اس حقیقت کو مولانا اکبر سے زیادہ واضح طور پر کسی نے بیان نہیں کیا جو نئی نسل کے مسلمانوں کی موجودہ عقلی زندگی پر ایک غائر نظر ڈالنے کے بعد حسرت آفریں لہجے میں پکار اٹھتے ہیں۔

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

اکبر الہ آبادی کے ان نظریات سے اقبال کا اتفاق ان کی زندگی کے آخر تک جاری رہا۔ ضربِ کلیم جو اقبال کی زندگی میں چھپنے والا ان کا آخری مجموعہ تھا (ارمغانِ حجاز بعد از وفات شائع ہوا) اس میں اقبال نے نئی نسل کے بارے میں اس نقطۂ نظر سے انحراف نہیں کیا جو اکبر نے پیش کیا تھا اور جس کی تائید اقبال کرتے آئے تھے۔ یعنی مغربی تہذیب ہماری تہذیب کے لیے زہرِ قاتل ہے، مغرب کے جدید فلسفیانہ نظریات نے ہمارے نوجوانوں کے اذہان کو منتشر کر دیا ہے۔ مدرسہ اور مکتب ہمارے نوجوانوں میں تخلیقی جوہر پیدا کرنے کی بجائے انھیں محض نقال اور پیروکار بناتے ہیں۔ جدید تعلیم ہمیں ان علوم و فنون کی طرف راغب کرتی ہے جو مفید تو ہیں لیکن ہمیں توانائی اور طاقت سے محروم کر کے خود زور اور قوت سے ہمارے اقتصادی ذرائع پر قابض ہو کر ہمیں ہمیشہ کے لیے محکوم رکھنا چاہتے ہیں اس لیے ہمیں علوم و فنون کے ساتھ ساتھ طاقت بھی حاصل کرنی چاہیے۔ اس

قسم کے اشعار میں سے چند ایک بطور مثال درج ذیل ہیں۔

یہ زور دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

....

انجامِ خرد ہے بے حضوری ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت

....

ترا وجود سراپا تجلیِ افرنگ کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکر خاکی خودی سے ہے خالی فقط نیام ہے تو زر نگار و بے شمشیر

....

وہی ہے بندۂ حر جس کی ضرب ہے کاری نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیاری

....

محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی موسیقی و صورت گری و علمِ نباتات

....

اہلِ دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہلِ نظر کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ

....

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

....

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

....

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش
دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کی تگ و دَو
اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

ان اشعار میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اگر اکبر زندہ ہوتے تو ان سے پوری طرح اتفاق کرتے۔

سرسید کو شاید چند باتوں سے اختلاف ہوتا مگر بعض خیالات سے وہ بھی اتفاق کرتے تاہم کہتے کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا جب مسلمانوں کی نئی نسل کو درسِ انقلاب دیا جائے۔

اکبرالہ آبادی نے بھی سرسید کی طرح زمانے اور ماحول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جہاد کی تبلیغ نہیں کی مگر سرسید کے برعکس طاقت اور زور کو وہ بھی ضروری خیال کرتے ہیں اور کئی جگہ اس کی تلقین کرتے ہیں کہ دنیا میں طاقت بڑی اہمیت رکھتی ہے اور اس کا توڑ بھی یہ ہے کہ خود طاقت حاصل کی جائے۔

نہ ہو مذہب میں جب زورِ حکومت   تو وہ کیا ہے فقط اک فلسفہ ہے

....

تعلیم جدید سے ہوا کیا حاصل   ہاں کفر کے ساتھ جنگ جوئی نہ رہی

....

مخالفت سے نہ باز آئے گی دنی دنیا   فقط یہ زور سے دبتی ہے یاد رکھ یہ گر

....

جب قوت تھی سب دعوے تھے قوت ہوئی گم اب کچھ بھی نہیں
طاقت ہی کے سارے غمزے تھے کمزور کا مذہب کچھ بھی نہیں

....

جو پوچھا میں نے حضرت میری عزت کیوں نہیں کرتے   تو وہ بولے کہ تم اظہارِ قوت کیوں نہیں کرتے

اکبر کا یہ نقطۂ نظر کہ طاقتور قوموں سے سب دبتے ہیں اور کمزور کو کوئی اہمیت نہیں دیتا آج کل بھی دنیا میں پوری شدت سے کارفرما ہے۔ اقبال کو اس نظریے سے مکمل اتفاق ہے جب کہ سرسید اپنے دور کے تقاضوں کے باعث اسے اپنے تحریروں میں در آنے نہیں دیتے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ۱۹۱۱ء سے لے کر آئندہ تقریباً دو دہائیوں تک اقبال نے وہی نقطۂ نظر اپنائے رکھا جو سرسید کے ہاں موجود نہیں لیکن اکبر کے ہاں جا بجا پایا جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس عرصے میں اقبال نے جو نظم و نثر لکھی وہ سرسید کے ذکر سے خالی ہے۔ انھوں نے سرسید کی حکمتِ عملی سے اعراض کیا، مگر ان کے تعلیمی کاموں پر تنقید کی اور علی گڑھ اور اس کی پیروی میں قائم کیے ہوئے تعلیمی اداروں سے نکلنے والے نوجوانوں کے ذہن، مزاج اور طریقِ کار سے اختلاف کیا لیکن کہیں سرسید کا نام لے کر تنقید نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سرسید کے خلوص کے قائل تھے اور غالباً اس بات کے بھی کہ ایک خاص وقت تک ان کی حکمتِ عملی درست تھی۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے آغاز تک مجھے اقبال کی تحریروں میں سر

سید کا نام کہیں دکھائی نہیں دیا۔ Reconstruction of Religious Thought in Islam میں کئی موضوعات ایسے ہیں جہاں سرسید اور ان کے افکار زیرِ بحث آ سکتے تھے مگر اس سے گریز کیا گیا ہے۔ ان میں سے یہ چھ خطبات ۱۹۲۹ میں دیے گئے ہیں اور بعد ازاں ۱۹۳۴ء کے شروع میں ساتواں خطبہ Is Religion Possible? بھی اس مجموعہ خطبات میں شامل کر لیا گیا تھا۔

۱۹۳۲ء میں شائع ہونے والی مثنوی جاوید نامہ میں، جو شاعری میں اقبال کی اہم کتاب ہے اور اس پر وہ فخر بھی کرتے تھے، انھوں نے اپنے مرشد مولانا روم کے ساتھ سیرِ افلاک کی ہے۔ وہاں بے شمار موثر لوگوں سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں جن میں مسلم مشاہیر میں سے جمال الدین افغانی بھی شامل ہیں جو سرسید احمد خان کی پالیسی کے کھلے مخالف تھے مگر سرسید کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ اسی طرح خطبہ الہ آباد بھی جو ۱۹۳۰ء کے آخری مہینوں میں دیا گیا، سرسید کے ذکر سے خالی ہے حالانکہ اس میں ہندو اور مسلم کے دوقومیں ہونے کی بحث کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں سرسید کا نام ذہن میں آتا ہے لیکن اقبال نے ان کا نام نہ لینے کو ترجیح دی ہے۔

تاہم تیسری دہائی کے اردگرد اقبال کے ہاں سرسید کا ذکر کہیں کہیں پھر نظر آنے لگتا ہے۔ مثلاً آل پارٹیز مسلم کانفرنس دہلی منعقدہ ۱۹۲۹ء میں سر محمد شفیع نے ایک قرارداد پیش کی جس کی حمایت میں اقبال نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

> ''میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ آج سے نصف صدی قبل سرسید احمد خاں مرحوم نے مسلمانوں کے لیے جو راہِ عمل قائم کی تھی وہ صحیح تھی اور تلخ تجربوں کے بعد ہمیں اس راہِ عمل کی اہمیت محسوس ہو رہی ہے۔''

اسی طرح جنوری ۱۹۳۶ء میں اسلام اور قادیانیت کی بحث کے سلسلے میں نہرو کے جواب میں انھوں نے ایک طویل مضمون لکھا جس میں کہا گیا ہے کہ اسلام کے دورِ زوال میں سرسید، جمال الدین افغانی اور مفتی عالم جان جیسے لوگ انیسویں صدی میں پیدا ہوئے جو اسلام کی داخلی قوت (inner vitality) کا ثبوت ہیں۔

سید نذیر نیازی کی کتاب 'اقبال کے حضور نشستیں اور گفتگوئیں' ایک ڈائری ہے جو یکم جنوری ۱۹۳۸ء سے شروع ہوتی ہے۔ نیازی صاحب علامہ اقبال کے ہاں حاضر ہوتے تھے اور وہاں جو کچھ سنتے تھے اسے گھر جا کر قلمبند کر لیتے تھے۔ اس کتاب میں چند موقعوں پر علامہ اقبال نے سرسید کا ذکر بھی کیا ہے جس کے چند اقتباسات سرسید و اقبال کے ذہنی اتفاقات و اختلافات کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

''ارشاد ہوا ایک دور دورِ وفاداری تھا۔ اس دور میں قوم کا وجود ان افراد سے خالی

نہیں تھا جو دل سے حکومت کے وفادار تھے۔ بایں ہمہ ان کے دل میں مسلمانوں کا درد تھا اور وہ سچے دل سے ملت کے بہی خواہ تھے-- یوں باتوں باتوں میں... کا ذکر آ گیا [نکتے لگا کر سرسید کے نام کو حذف کیا گیا ہے۔ یہ نیازی صاحب کی احتیاط ہے] فرمایا: عام خیال یہ ہے کہ وفاداری ان کی گھٹی میں پڑی تھی یہ بات ایک حد تک ٹھیک ہے مگر وہ کرتے بھی تو کیا؟ وہ حکومت کے ممنونِ احسان تھے انھیں جو کچھ ملا سرکارِ انگریزی سے ملا لہٰذا انگریزوں سے ان کے حسنِ ظن اور انگریزوں سے ان کی وفاداری کی ایک وجہ ان کا جذبہ تشکر بھی تھا۔ یہ نہیں کہ وہ غلامی اور محکومی پر رضامند تھے جیسا کہ اربابِ سیاست عام طور پر سمجھتے ہیں۔ "(مذکورہ کتاب: ص۲۲)

"جس طرح آج آزادی اور استقلال کی صدائیں عام ہو رہی ہیں ایسے ہی ایک زمانہ تھا کہ بجز وفاداری کے کوئی دوسرا لفظ سننے میں نہیں آتا تھا۔ لیکن ان حضرات کا دل اس دورِ وفاداری میں بھی خلوص اور دردمندی سے خالی نہیں تھا۔ انھیں قوم سے سچی محبت تھی۔ پھر حقوق طلبی کا دور آیا اور اس دور میں بھی انھوں نے دیانت داری سے قوم کا ساتھ دیا مگر زمانہ بڑا تیز رو ہے۔ اسے نرم روی پسند نہیں... [ڈیش میں سرسید] بالطبع نرم رو، یا باصطلاحِ سیاست اعتدال پسند تھے اور اپنے اعتدال پسند احباب کی طرح ان تبدیلیوں کا ساتھ نہ دے سکے جو زمانہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔" (ایضاً: ۲۳)

جب نذیر نیازی نے استدلال کیا کہ اعتدال پسندی ان حالات میں سرسید کی مجبوری تھی تو انھوں نے فرمایا:

"سرسید کی ذات بڑی بلند تھی بڑی ہمہ گیر، افسوس ہے مسلمانوں کو پھر ویسا کوئی رہنما نہیں ملا۔" (ایضاً: ۲۴)

نذیر نیازی سرسید اور علی گڑھ کے بارے میں کچھ سوچ رہے تھے کہ علامہ اقبال نے مزید کہا:

"غلامی اور محکومی بہت بڑی لعنت ہے۔ حکومت اور اقتدار ایک سحر ہے جس سے محکوموں کے دل و دماغ ماؤف ہو جاتے ہیں علی گڑھ کی کتنی بڑی خوبی ہے کہ اس نے ہمارے دل و دماغ کو محفوظ رکھا۔ یا پھر یوں کہنا چاہیے کہ اسلام میں زندگی کی بے پناہ قوت ہے۔ یہ قوت علی گڑھ میں بھی کارفرما تھی۔ لہٰذا باوجود مغربی تعلیم کے

مسلمانوں کا جذبۂ ملی برقرار رہا۔‘‘ (ایضاً: ۲۶)

گویا اقبال یہ سمجھتے تھے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے زمانے میں انگریز کی وفاداری کا راگ الاپنا مجبوری تھی۔ سر سید قوم کی خدمت کے لیے مخلص تھے لیکن جب چند دہائیاں گزر گئیں اور حقوق طلبی کا زمانہ آیا تو پھر بھی سر سید اپنی افتادِ طبع کے مطابق نرم روی اختیار کیے رہے کیونکہ وہ مزاجاً اعتدال پسند تھے اور زمانہ جو تبدیلیاں لایا اس کا ساتھ نہ دے سکے ــــــ یہاں سر سید کے دفاع میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ واقعات میں تیزی سے تبدیلیاں سر سید کی وفات کے بعد آئیں اس لیے اگر سر سید دس بارہ سال مزید زندہ رہتے تو کیا وہ اپنی حکمتِ عملی تبدیل نہ کرتے؟ یا کیا وہ اپنے سابقہ رویے پر بدستور قائم رہتے؟ اس بارے میں کچھ کہنا محض قیاس آرائی ہے۔

علامہ اقبال کا یہ خیال ہے کہ علی گڑھ نے ہمارے دل و دماغ کو محفوظ رکھا، اس حد تک درست ہے کہ دو قومی نظریے کو سر سید کے بعد آنے والے علی گڑھ ہی کے لیڈر آگے لے جانے والے تھے اگرچہ ان کی عمومی بیداری مغرب پسند تھی۔ تاہم کانگرس بیزار ضرور تھی۔

۳ / مارچ ۱۹۳۸ء کو اقبال نے سر سید، علمائے ہند اور کانگرس کے سلسلے میں کچھ گفتگو کی جسے سید نذیر نیازی نے ذیل کے الفاظ میں قلمبند کیا ہے۔

علامہ اقبال نے اپنا ایک مضمون 'فیز' کرنے کے لیے چودھری محمد حسین کو دے رکھا تھا۔ اس کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

> ’’میرے مضمون سے بہت سی باتیں صاف ہو جائیں گی۔ علما حضرات کی یہ بہت بڑی غلطی ہے کہ اپنی انگریز دشمنی میں کانگرس کا ساتھ دے رہے ہیں اور غیر اسلامی تصورات قبول کر رہے ہیں۔ کسی وقت انھوں نے انگریزوں کا ساتھ دینے پر سر سید کی بڑی سختی سے تنقید کی تھی۔ یہ تنقید خلوص پر مبنی تھی اور اس میں ایک عنصر صداقت کا بھی موجود تھا لیکن کانگرسی خیال علماء ہندوؤں کا ساتھ دے کر اس سے بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ اگر قوم نے ان کا ساتھ دیا تو اس کا نتیجہ نہایت مہلک ہوگا۔‘‘

گویا کانگرس کی مخالفت اور مسلمانوں کو اس کی سیاست سے الگ رکھنے کے معاملے میں علامہ اقبال کو سر سید سے مکمل اتفاق تھا۔

۷؍ مارچ ۱۹۳۸ء کی نشست میں پھر سرسید کا ذکر آیا۔ علامہ نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے سرسید کی خدمات گنوانے کے بعد کہا:

''میں تسلیم کرتا ہوں کہ سرسید کے خیالات اور ان خیالات کے ماتحت انھوں نے جو اقدامات کیے وہ تنقید سے بالاتر نہیں۔ اس میں گفتگو کی گنجائش ہے۔ لیکن یہ اقدامات ضروری تھے۔ حالات کا تقاضا تھا کہ کوئی ایسا اقدام کیا جاتا جس سے مسلمانوں کی توجہ وقت کے تقاضوں اور مستقبل کی طرف منعطف ہوتی۔ سرسید کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے یہ اقدام کیا۔ یہ اقدام بہرحال ضروری تھا۔ یہی بات ہے جو ان کے نکتہ چینوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔''

یہ گفتگو کچھ عرصہ جاری رہی۔ علامہ اقبال علمائے ہند کے خلوص کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ سیاسی معاملات میں ان کے خلاف تحفظات کا اظہار کرنے کے بعد فرمانے لگے کہ علماء کا احتجاج انگریزوں کے خلاف غم و غصہ کا اظہار ہے جو ضروری ہے مگر وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ تصادم کوئی بھی شکل اختیار کرے، اس میں وہی گروہ کامیاب ہوگا جو اندرونی طور پر مستحکم ہے اور جس کا اپنا کوئی واضح نصب العین ہے۔

''البتہ سرسید اس نکتے کو خوب سمجھے۔ انھوں نے نہایت صحیح کہا کہ مجھے ایسے آئین سے کوئی دلچسپی نہیں جس میں میرا کوئی حصہ نہیں ... ارباب دیوبند اگر ماضی ہی پر نظر ڈالیں تو ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہوگا کہ کانگرس نے آج سے پچیس سال پہلے جس آئینی جدوجہد کی ابتدا کی تھی آزادیِ ہند اسی جدوجہد کی مرحلہ بہ مرحلہ کامیابی کی آخری شکل ہے لیکن اس کی روح اور اساس وہی ہے جس کے پیشِ نظر سرسید نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ ہم کانگرس سے الگ رہیں۔ کانگرس میں شرکت کا یہ مطلب ہوتا کہ ہم نے اس فرضی اور خیالی یعنی ہندوستانی قومیت کا وجود تسلیم کرلیا ہے جو دراصل ہندو قومیت ہی کا دوسرا نام ہے۔ ہندوستانی قومیت کا اقرار امت کے جداگانہ وجود کا انکار ہے۔''

اس استدلال کو آگے بڑھاتے ہوئے علامہ نے مزید فرمایا:

''سرسید کی رائے نہایت صائب تھی۔ سرسید نے خوب سمجھ لیا تھا کہ ہندوستان کا

قومی مسئلہ کیا تھا... سرسید کا کتنا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اس خطرے کو بھانپ لیا جو بہ حیثیت ایک قوم مسلمانوں کو درپیش تھا! انھوں نے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت پر زور دیا۔ وہ جب تعلیم پر زور دیتے، تہذیب وتمدن میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتے جب بھی ان کا کہنا یہی تھا کہ ہم اپنا جداگانہ ملی وجود ہر حالت میں قائم رکھیں ... یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ کی بدولت ایک عام بیداری پیدا ہوئی اور قوم کے قوائے علم وعمل حرکت میں آئے یہ گویا ہماری نشاۃ الثانیہ ہی کی ایک تحریک تھی۔"(بحوالہ بالا کتاب :ص ۹۳ -۲۹۴)

ان حوالوں سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اقبال زندگی کے آخری چند برسوں میں، خصوصاً اس زمانے میں جب ہندوستاں کے مسلمان رہنماؤں اور دانش وروں کی طرف سے کسی نہ کسی صورت میں دوقومی نظریے کی بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم یا نئی داخلی حد بندی کی تحریری یا زبانی تجویزیں زیر بحث آنی شروع ہو گئی تھیں دوبارہ سرسید کے نقطۂ نظر کی طرف جزوی طور پر پلٹ آئے تھے۔ اشتیاق حسین قریشی کی کتاب The Struggle for Pakistan (ص ۱۱۵) کے مطابق اس قسم کی تجاویز پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے شروع ہو گئی تھیں مگر ان کی نوعیت سال بہ سال شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی۔ ۱۹۱۷ء میں خیری برادران نے، ۱۹۲۷ء میں ڈیرہ اسماعیل خان کے سردار گل محمد نے، ۱۹۲۸ء میں سر آغا خان نے، ۱۹۳۰ء میں خود اقبال نے الہ آباد میں، ۱۹۳۳ء میں چودھری رحمت علی نے اپنے کتابچے Now or Never میں، ۱۹۳۸ء میں حیدرآباد کے سید عبداللطیف نے اور اس کے علاوہ کئی دیگر دانش وروں نے کسی نہ کسی صورت میں تقسیم ہند کی وکالت کی۔ قدرتاً سرسید احمد خان نے مسلمانوں کے لیے کانگرس سے الگ رہنے کی جو پالیسی اختیار کی تھی وہ بہت زیادہ زیرِ بحث آئی اس لیے اقبال نے بھی اسی سیاق وسباق میں سرسید کی سیاسی بصیرت کا ذکر از سرِ نو شروع کیا۔

کانگرس سے مسلمانوں کو الگ رکھنے اور مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ سمجھنے اور محض مسلمانوں کی ترقی کے لیے اقدامات اٹھانے کی وجہ سے سرسید دوقومی نظریے کے بانی قرار پاتے ہیں۔ اقبال اپنی شاعری کے دورِ اوّل میں ہندو مسلم اتحاد کے حامی رہے ہیں لیکن بعدازاں وہ دوقومی نظریے کے قائل ہوتے چلے گئے حتیٰ کہ انھوں نے شمالی مغربی ہند کو الگ ملک قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ گویا وہ سرسید کے دوقومی نظریے کے ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۸ء تک ہمیشہ قائل رہے۔ لیکن اس دوران وہ سرسید کی حکمتِ عملی سے بہت سی باتوں میں اختلاف کرنے لگے تھے۔ اپنی وفات کے سال میں یہ کہنا کہ سرسید کو قوم سے سچی محبت تھی... علی گڑھ نے باوجود مغربی تعلیم کے مسلمانوں کا

جذبہ ملی برقرار رکھا... (البتہ) سرسید کے خیالات تنقید سے بالاتر نہیں تھے... لیکن علی گڑھ نہیں سمجھا کہ اسلام نے تہذیب وتمدن کا ایک اپنا تصور قائم کیا ہے اور ہماری انفرادیت اور جداگانہ تشخص کا راز اس کوشش میں مضمر ہے کہ اس تصور کی ترجمانی اپنے عمل میں کریں ایسے ہی یہ حقیقت بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل رہی کہ اسلام بجائے خود ایک نظام اجتماع وعمران ہے لہٰذا ہمیں چاہیے کہ جو بھی سیاسی لائحہ عمل مرتب کریں، اس کی رعایت سے کریں ایسا نہ کرنے کی وجہ سے کہ ہماری صفوں میں انتشار پیدا ہوتا گیا اور کوئی صحیح قیادت نہ ہو سکی۔ خواص کا رشتہ عوام سے کٹ گیا، عوام پرانی روایات اور ماضی میں الجھے رہے۔ خواص نے اپنے اردگرد ایک مصنوعی دنیا آباد کر لی، ایسی دنیا جس کی فضا سرتا سر مغربی تھی۔ ان کا دل مغرب میں تھا۔ بدن قومی رشتوں میں جکڑا ہوا، گویا دہری زندگی بسر کر رہے تھے۔ اندریں صورت وہ تحریکیں بھی جو بطور احتجاج یا ردعمل کے پیدا ہوئیں بے نتیجہ رہیں۔ وہ بھی ہماری نشاۃ الثانیہ کا صحیح رخ متعین نہیں کر سکیں۔ (اقبال کے حضور، ص ۲۴، ۲۵، ۲۶)

یہاں اقبال نے قدرے تفصیل سے اپنے اور علی گڑھ تحریک کے ذہنی فاصلوں کا ذکر کیا ہے۔ ردعمل کی تحریکوں سے مراد علما کی تحریکیں خصوصاً اہل حدیث اور دیوبندیوں کی سیاسی سرگرمیاں ہیں۔ اقبال نے ۴/مارچ کی گفتگو میں ان تحریکوں سے شدید اختلاف کیا ہے۔ خصوصاً اہل حدیث علما کو انگریز کی مخالفت میں کانگرس کا ساتھ دینے پر ہدف تنقید بنایا ہے۔ گویا بدلے ہوئے حالات میں اقبال سرسید سے کئی باتوں میں متفق نہیں تھے۔ علمائے اہل حدیث و دیوبند (خصوصاً مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے ساتھیوں) کے بیانات اور طرزِ عمل نے علامہ کو نظریۂ قومیت میں سرسید کی صداقت کا اور بھی قائل کر دیا تھا تاہم وفات تک کسی مرحلے پر انھوں نے اکبر کے خلاف کوئی تنقیدی جملہ نہیں لکھا البتہ یہ بھی درست ہے کہ انھوں نے اکبر سے تعرض بھی نہیں کیا جس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اکبر نے اپنے خیالات کے لیے شاعری کو میڈیم بنایا ہے اور سنجیدہ قومی و ملی و مفکرانہ موضوعات کے لیے شاعری سے اقتباس کرنا مناسب خیال نہیں کیا لیکن اسلام کو ایک نظام اجتماع وعمران قرار دینا اور مسلمانوں کے لیے تمام فیصلے اسلامی تہذیب وتمدن کی روشنی میں کرنے پر بھرپور توجہ دلانا اکبر کے خیالات سے بہت قریب معلوم ہوتا ہے خصوصاً یہ جملے:

> ''علی گڑھ نہیں سمجھا کہ اسلام نے تہذیب وتمدن کا ایک اپنا تصور قائم کیا ہے ہماری انفرادیت اور جداگانہ تشخص کا راز اس کوشش میں مضمر ہے کہ اس تصور کی ترجمانی اپنے عمل میں کریں... خواص نے اپنے اردگرد ایک مصنوعی دنیا آباد کر لی۔ ایسی دنیا جس کی فضا سرتا سر مغربی تھی ان کا دل مغرب میں آباد تھا بدن قومی رشتوں میں

جکڑا ہوا۔ وہ گویا دہری زندگی بسر کر رہے تھے۔"

ان جملوں کو پڑھ کر اکبر کے کئی اشعار ذہن میں گونجنے لگتے ہیں:

فخریہ میں نے جو اشعار پڑھے سعدی کے　　فخریہ آپ سنانے لگے نظمِ ملٹن
شیخ سعدی تو بزرگوں میں تھے میرے اے دوست　　آپ کے کون تھے ملٹن یہ سنوں قبلۂ من

....

وہ فقط وضع کے کشتے ہیں نہیں فکر کچھ اور　　بھینس کو گاؤن پنھا دیجیے عاشق ہو جائیں

....

خدا جانے کہا کس نے یہ کس دن عقلِ مسلم سے　　کہ مشرق کو نظر آتا نہیں مغرب سے چھٹکارا
ہوا سب کو تعجب کیوں ہوئیں یہ حالتیں پیدا　　نہ تھا یہ مقصدِ سید کہ اس رخ پر چلے دھارا

ماحصل

مغلیہ سلطنت کے زوال اور خصوصاً ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی مسلمان زوال کی پستی سے ابھرے تو دو مفکر اور دانشور خصوصی طور پر اس کا سبب بنے یعنی سرسید اور اقبال۔ سرسید کے رفقا میں حالی، نذیر احمد، شبلی وغیرہ کی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا مگر ان کی سرگرمیوں کا اصل محور بھی سرسید ہی کی ذات تھی۔ اکبرالہ آبادی کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ وہ سرسید تحریک کا ردِعمل تھے لیکن اس نقطۂ نظر میں محض جزوی صداقت ہے۔ اکبر نے ابتدائی دور کی نظم و نثر میں اودھ پنچ کے زیرِ اثر سرسید تحریک کی مخالفت کی تھی مگر رفتہ رفتہ وہ کئی نکات پر سرسید سے متفق ہو گئے تھے۔ چنانچہ بعد کی شاعری میں انھوں نے مغربی تعلیم کی مشروط حمایت کی اور یہ نظریہ پیش کیا کہ مغرب کی سائنس اور ٹیکنالوجی سے استفادہ کرنا چاہیے مگر ان کے بعض فلسفیانہ نظریات کو قبول نہیں کرنا چاہیے۔ علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کے 'ثمرات' کو وہ سخت ناپسند کرتے تھے کہ علی گڑھ کی پہلی نسل نے اور اس سے بھی زیادہ دوسری نسل نے تمدنی طور پر مغرب کے گہرے اثرات قبول کر لیے تھے مگر ان کی جستجو، تحقیق اور سائنسی ایجادات کا راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ علاوہ ازیں علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے والوں میں سے متعدد لوگ ایسے تھے جو 'دیسی صاحب' بن گئے تھے اور قوم کے پرانے فیشن پر قائم رہنے والوں کی تحقیر کرتے تھے۔

خود اپنی قوم کی تحقیر کرنا اس کے کیا معنی　　یہ کس جادو نے بچوں کو کیا خود بین و خود آرا
یہ کس کُل کے بنیں گے جز و کھو کر اپنی ملت کو　　مگر ہاں اپنے بیلوں میں ملا لے کوئی بنجارا

وقت نے بتایا کہ علی گڑھ کے تعلیمی ماحول اوران کے اس ثمرات پر یہ تنقید وزن رکھتی ہے لیکن سرسید کے دفاع میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب انھوں نے اپنی اصلاحی تحریک کا آغاز کیا، اس وقت حکومت سے مدد لینا ضروری تھا اور امداد دینے والے اپنی شرائط پر امداد دیتے ہیں۔ سرسید احمد خان کی مخالفت ان کے لبرل خیالات کی وجہ سے بھی ہوئی لیکن ان کے مذہبی خیالات جو ان کی تفسیر قرآن سے ظاہر ہوتے ہیں، خصوصی طور پر مخالفت کی وجہ بن گئے۔ سرسید نے لکھا ہے کہ مذہبی بحث اس مجبوری کے تحت کی جاتی ہے کہ ہمارے ہاں جس بات پر لوگوں کو آمادہ کیا جائے یا روکا جائے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ایسا مذہبی احکام کی وجہ سے کرتے ہیں۔ پھر انھیں بتانا پڑتا ہے کہ مذہبی احکام دراصل کیا ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ معجزات اور خوارق عادت پر اس شدت سے حملے کیے بغیر بھی ان کی تحریک مطلوبہ نتائج حاصل کر سکتی تھی۔

جہاں تک سرسید کے سیاسی مصالح کا تعلق ہے، اکبرالہ آبادی اس سلسلے میں واضح نہیں ہیں۔ انھوں نے انگریزوں کے خلاف سیاسی تحریکوں کے آغاز کا دور دیکھا۔ وہ سرسید کی طرح انگریزی حکومت کے حامی تو ہرگز نہیں تھے اور کانگرس کے خلاف بھی تحفظات رکھتے تھے مگر اس دور کی مسلم لیگ چونکہ ابھی عوامی جماعت نہیں بنی تھی اس لیے ان کے ساتھ بھی نہیں تھے۔ گاندھی کے طریق کار یعنی تحریکِ آزادی کو عوام تک پہنچانے سے وہ متاثر تھے لیکن کانگرس رہنماؤں کے 'مسلمان مخالف' مزاج سے ناخوش تھے خصوصاً دیوناگری رسم الخط کی تحریک نے انھیں کانگرس سے برگشتہ کر دیا تھا لیکن اس زمانے میں مسلمانوں کے سامنے دو ہی راستے ہو سکتے تھے۔ کانگرس کی مخالفت کریں اور انگریزوں کا ساتھ دیں یا انگریزوں کی مخالفت کریں اور کانگرس کا ساتھ دیں۔ دونوں میں سے کسی ایک طرزِ عمل کو اپنانے سے مسلمانوں کو نقصان ہی نقصان تھا اس لیے اکبر اس معاملے میں غیر واضح رہے۔

علامہ اقبال ۱۹۰۵ء تک ایک طرف ہندو مسلم اتحاد کے قائل تھے تو دوسری طرف علی گڑھ کی حکمتِ عملی کے بھی حامی تھے۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک وہ یورپ میں رہے اور ہندوستان کی سیاست سے قریب قریب لاتعلق۔ واپس آئے تو رفتہ رفتہ ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کا احساس ہونے لگا۔ سرسید اور ان کے خیالات سے تو وہ پہلے ہی آگاہ تھے مگر سیاسی حالات اور واقعات تیزی سے بدلنے لگے۔ پہلی عالمی جنگ اور ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کی سرگرمیوں نے انھیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ اب سرسید کی اس حکمتِ عملی پر چلنا ممکن نہیں تھا کہ مسلمان انگریزوں کے قریب رہ کر ان سے فائدہ اٹھائیں۔ ایسے میں انھیں اکبرالہ آبادی کے کلام کی روشنی نظر آ گئی جس میں علی گڑھ کے طرزِ عمل سے اختلاف کیا گیا تھا اور برطانوی پالیسیوں کی مخالفت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو اصل اسلامی عقائد پر چلنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ انھیں یہ خیالات پسند آئے چنانچہ انھوں نے کلامِ اکبر کی ستائش اور پیروی

شروع کی لیکن وہ سرسید کے اس طرزِ عمل کو درست سمجھتے تھے کہ مسلمان ہندو کانگرس سے الگ رہیں۔ اقبال کسی وقت بھی کانگرس کے حامی نہیں رہے تھے اور وہ سرسید کے نقطۂ نظر کے مطابق یہ سمجھتے تھے کہ کانگرس کی جدو جہد کا ساتھ دے کر مسلمانوں کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۹ء تک اقبال سرسید کی بہت سی پالیسیوں سے اختلاف رکھتے تھے لیکن ان کی خدمات کی وجہ سے ان پر تنقید بھی نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے سرسید اور ان کے نقطۂ نظر کے بارے میں خاموشی اختیار کیے رکھی۔

۱۹۳۰ء سے اقبال کو پھر یہ احساس ہوا کہ کم از کم سیاسی طور پر سرسید کی حکمتِ عملی بالکل درست تھی۔ چنانچہ خطبۂ الہ آباد اسی نقطۂ نظر کی عکاسی کرتا ہے۔ پھر دو گول میز کانفرنسوں میں اقبال کا خاموشی اختیار کرنا اور مسلمانانِ ہند کے لیے کانفرنسوں سے باہر اہم لوگوں سے ملاقاتیں کرنا، سرسید ہی کی بنیادی پالیسی کو آگے بڑھانے کی کاوش تھی۔ پھر پنجاب میں مسلم لیگ کی تنظیم میں موثر کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ اشتراکِ عمل اور اپنی زندگی کے آخری دو برسوں میں انھیں خطوط لکھ کر اپنے نقطۂ نظر اور خصوصاً پنجاب کی سیاست سے آگاہ کرنا بھی اسی حکمتِ عملی کا حصہ تھا۔

قومی تشخص کا پرچار، ہندوستانی مسلمانوں کو خالص اسلام کی طرف بُلانا جس میں عجمی اور ہندی عناصر شامل نہ ہوں، انگریزی تہذیب و معاشرت کی نقالی کی زوردار مخالفت وغیرہ کی وجہ سے اقبال نے اکبر کے موقف سے اپنی وفات تک اختلاف نہیں کیا، اس لحاظ سے اقبال کو سرسید اور اکبرالہ آبادی کا synthesis کہنا مناسب ہوگا۔

علامہ اقبال نے اپنی زندگی کے آخری چند برسوں میں اجتہاد کی تبلیغ کی۔ یہ سرسید ہی کے نقطۂ نظر سے استفادہ کرنے والی بات تھی لیکن اقبال نے یہ احتیاط کی عام نقطۂ نظر سے ہٹے ہوئے خیالات The Reconstruction of Religion though in Islam میں پیش کیے لیکن اپنی شاعری کو بہت حد تک ان سے الگ رکھا۔ چونکہ Reconstruction فلسفیانہ اصطلاحات کے ساتھ لکھی گئی ہے اس لیے ان کی وہ مخالفت نہیں ہوئی جو سرسید کی تفسیر قرآن کی ہوئی۔

* یہ مقالہ Iqbal Memorial Lacture کے سلسلہ میں نومبر 2009ء کو پڑھا گیا۔